تبصرۂ کتب

طواسینِ اقبالؒ

ایس ایم عمر فاروق
کرنل غلام سرور

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ک88

تبصرہ کتب

طواسین اقبال

السید امام عمر فاروقی

کرنل غلام سرور

All rights reserved
©2002-2006

نام کتاب : طواسینِ اقبال
مصنف: ایس ایم عمر فاروق
ناشر: اقبال اکادمی پاکستان
مبصر: کرنل غلام سرور

جناب عمر فاروق نے اپنی کتاب "طواسینِ اقبال" کو فلسفۂ توحید کے تناظر میں ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب فلسفۂ ایقان، مذہب، ریاست، عقل اور وجدان کے متعدد پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ فلسفۂ اقبالؒ کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا، جس کا ثبوت ہمیں اُن کے خطبات میں ملتا ہے۔ اقبالؒ کا فلسفہ وحدت الوجود کے تصور سے براہِ راست متصادم ہے۔ وحدت الوجود کی اساس فلسفۂ افلاطون پر ہے، جو اسلامی تعلیمات کی عین ضد ہے۔ علامہؒ نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں فلسفۂ توحید کے خدوخال واضح کیے اور ساتھ ہی انہوں نے افلاطون کے اُس فلسفے کو ہدفِ تنقید بنایا، جو ہمیں گوسفندی کا درس دیتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں برگسان کے فلسفے میں بڑی جاذبیت دکھائی دی۔ انہوں نے زندگی کے متحرک اور فعال ہونے اور قوتِ ارادی کی آزادی کا غلغلہ برگسان کے ہاں وافر مقدار میں پایا۔ وہ اپنے تصورِ خودی اور فلسفۂ حرکت کے ضمن میں برگسان کے فلسفۂ زمان سے خاصے متاثر ہوئے۔

لیکن اقبال نے برگسان کے اس نظریے کی کورانہ تقلید نہیں کی، بلکہ اُس پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔ برگسان زمانے کو ایک لکیر سمجھتا ہے جو ابھی کھنچی جا رہی ہے۔ اس کی ایلان واٹل (Elan Vital) اندھا دھند پھیلتی پھولتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ اس کا کوئی مقصد ہے، نہ کوئی منزل۔ اس کے برعکس، اقبالؒ زندگی کو مقاصد سے بھرپور دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں اس رزم گاہِ حیات میں خودی ہی وہ واحد اکائی ہے جو زندگی کا اصل ماحصل ہے۔ خودی کو بلند کرنے کے لیے فطرت کو مسخر کرنے کی تڑپ اقبالؒ کے ہاں موجزن ہے اور یہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اقبال نے ہیلن ازم (Hedonism) کے خلاف اسرارِ خودی میں آوازِ بلند کی اور کہا کہ زندگی سے فرار

ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ انسانی زندگی، ارتقا اور تخلیق سے عبارت ہے۔ وجود کی حقیقت عقل نہیں، بلکہ عمل ہے۔ اصل حیات تسخیر و تخلیق ہے باقی سب سحر و فسوں ہے۔

نطشے کے حوالے سے مصنف طواسین رقم طراز ہیں کہ اقبال اور نطشے نے اپنے زمانے کی ذہنی پستی اور قنوطیت کے خلاف آواز بلند کی۔ نطشے کے جذبے کی شدت نے جرمن قوم میں حرارت پیدا کی اور اسی خوبی کی بنا پر وہ امر ہو گیا۔ اِدھر اقبالؒ نے اسلامی کلچر کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑہ اٹھایا اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو آواز دے کر انہیں جمود کے گرداب سے نکالا۔ نتیجۃً اقبال مرجع خلائق بن گیا۔ دونوں مشاہیر نے زمانے کی ذہنی پستی اور قنوطیت کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ خصوصیت دونوں میں مشترک ہے، مگر اس فکری ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ دونوں کی سوچ میں بڑے اخلاقی پہلو بھی موجود ہیں۔ نطشے، مادیت پر یقین رکھتا ہے اور وہ انسانی روح کی ذاتی ابدیت سے بھی منکر ہے۔ اُسے یقین ہے کہ روح، بدن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس تصور کے برعکس، اقبالؒ، ذاتِ باری میں یقین رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں مذہب اور روزِ قیامت پر صدقِ دل سے یقین، انسانوں کے لیے اشد ضروری ہیں۔ اقبالؒ کا مردِ کامل تمام انسانیت کے لیے زندہ ہے۔ وہ الماس کی طرح سخت ہے، لیکن انسانی جذبات، ہمدردی، رحم اور شفقت میں ریشم کی طرح نرم ہے۔ اقبال کا مردِ مومن، زمانے کی جبریت کے علی الرغم، قوت حاصل کرنا چاہتا ہے اور خود ہی تقدیرِ الٰہی بن جانا چاہتا ہے۔

اقبال نے کائنات کے حوالے سے بھی دورِ حاضر کے نظریات کا احاطہ کیا ہے۔ وہ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت، ڈارون کے فلسفۂ ارتقا، برگساں کے تخلیقی ارتقا اور مسئلہ زمان و مکاں سے صرف آگاہ ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے ان نظریات پر عالمانہ تنقید بھی پیش کی ہے اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں زمانۂ حاضر کے علوم اور مذہبی اقدار و نظریات کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال، قرآنِ حکیم کی روشنی میں اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ کائنات کوئی بازیچۂ اطفال نہیں، بلکہ اس کے باطن میں آفرینش کا راز پنہاں ہے۔ زمانے کے لیل و نہار میں عقل والوں کے لیے باری تعالیٰ کی بہترین نشانیاں ہیں۔ زمان و مکان کی وسعتیں اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ انسان ان کا شعور حاصل کرے اور ان کی اصل ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کائنات محض نظارے کے لیے نہیں، اگر انسان فطرت کے سینے کو چیر کر اس کے اندر تک نہیں پہنچتا اور نگاہ کو صرف تماشے کے لیے وقف کر دیتا ہے، تو یہ اس کی بہت بڑی محرومی ہے ؎

اگر بہ سینۂ ایں کائنات در نروی　　نگاہ را بہ تماشا گزاشتن ستم است

طواسینِ اقبال میں جناب عمر فاروق نے آگے چل کر اقبال اور اسپنگلر کے خیالات کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسپنگلر نے پرزور دلائل کی بنا پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی تہذیب ختم ہو چکی ہے اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ وجہ؟ کلچر جب مر جاتے ہیں تو دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔ اسپنگلر کے خیال میں اسلام ایک مجوسی تہذیب کا مذہب ہے اور اس کا اپنا کوئی کلچر نہیں۔ اس نے یہ فلسفہ اقوام بھی پیش کیا کہ ایک قوم کا کلچر، دوسری قوم کے کلچر سے متاثر نہیں ہوتا اور ہر کلچر کی اپنی الگ انفرادیت ہے۔ اقبال کا فلسفۂ اقوام، ان دعوؤں کی نفی کرتا ہے۔

اسپنگلر کے خیال میں عالم رنگ و بو یعنی کائنات کے ادراک و تسخیر کے دو ہی طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ ہے، کائنات کو عقل کے ادراک میں لانا۔ اور دوسرا طریقہ ہے حرکی یا Vital یعنی روحانیت کے بل بوتے پر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ عقلی طریقہ محض علت و معلول کے آپس میں ربط کا طریقہ ہے۔ اسے ایک میکانکی نظریہ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن روحانی طریقہ زندگی کو مکمل طور پر اپنانے کا نام ہے۔ انسان کی زندگی ہی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر روحانی اور اخلاقی قوت پیدا کرے اور پھر سلسلۂ روز و شب کی تخلیق کرے۔ انسان صرف Vital یا روحانی طریقۂ کار ہی سے عالم کو مسخر کر سکتا ہے قرآن حکیم کے مطابق یہی اصل "ایمان" ہے۔

اسپنگلر نے اپنی کتاب "زوالِ مغرب" میں لکھا ہے کہ اسلام میں قسمت کے تصور نے ایگو (Ego) کی قطعی طور پر نفی کر دی ہے۔ یعنی انسان کو اس کی خود مختاری سے محروم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان قوم، حرکت کے تصور سے نا آشنا ہے۔ علامہ اقبال اس ضمن میں فرماتے ہیں:

"ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم میں قسمت کا تصور شروع سے لے کر آخر تک پھیلا ہوا ہے لیکن تقدیر کا جو تصور قرآن کریم میں ہے، وہ قسمت کے اس تصور سے مختلف ہے جو اسپنگلر نے سمجھا ہے۔"

علامہ اپنے دوسرے خطبے میں یوں رقمطراز ہیں:

"دنیا کو روحانی طریقے سے مسخر کرنے کا طریقہ سلسلۂ شب و روز کے وقت کو تخلیق کرتا ہے۔ تقدیر وقت ہے جو مستقبل کے انکشاف سے پہلے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے، جو اپنے ذہن میں ہم محسوس کرتے ہیں، نہ کہ محض استدلال و عقل سے پہچانتے ہیں۔"

اقبال کے نزدیک، تقدیر کوئی باہر سے طاقت کے ذریعے مجبوری نہیں۔ یہ ہر شے کی اندرونی

طاقت ہے جس میں مستقبل کے تمام انکشافات مرکوز ہیں اور یہ انکشافات اسلسلۂ روز و شب یعنی وقتِ مسلسل میں بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اسلامی اندازِ فکر میں جیسے اسپنگلر نے اسے سمجھا خودی کی نفی نہیں۔ یہ دراصل زندگی ہے..... بے انتہا قوت کی حامل زندگی جس کے سامنے کوئی دشواری حائل نہیں ہوتی اور یہ وہ جذبہ ہے جس کی بدولت ایک انسان، اطمینان سے اس وقت بھی عبادت میں مشغول رہتا ہے جب اس کے آس پاس گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو۔

اسپنگلر کے فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ ہر ایک کلچر، بالکل منفرد اکائی کا نام ہے۔ اس کا نہ کوئی تعلق ماضی کے کسی کلچر سے ہوتا ہے اور نہ اس کا اثر کسی آنے والے کلچر پر مرتب ہو سکتا ہے۔ اسپنگلر کے مطابق ایک کلچر اس وقت ظہور پذیر ہوتا ہے جب ایک عظیم روح ایک جمِ غفیر کے درمیان سے انگڑائی لیتی ہے اور ایک بے ہیئت چیز سے علیحدہ ہو کر ایک ہیئت والی چیز میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس روح کی بدولت کلچر پھلتا پھولتا ہے اور جب اس روح کے کارنامے ختم ہو جاتے ہیں تو یہ کلچر ابدی نیند سو جاتا ہے۔

علامہ اقبال، اسپنگلر کے اسی نظریے سے کہ ایک کلچر کا دوسرے کلچر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں یہ نظریہ صرف اسی لیے پیش کیا گیا ہے کہ یورپ کے کلچر میں اینٹی کلاسیکل اسپرٹ کو کہیں اسلام کی اس تحریک کا ماخذ نہ سمجھ لیا جائے جو اس نے یونانیت کے خلاف شروع کی تھی۔ اسپنگلر نے ادبی دیانت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ یونانیت کے خلاف جو اثرات یورپین کلچر میں نظر آتے ہیں سراسر اس کے اپنے کلچر کے مرہونِ منت ہیں اور اس میں اسلام کے کلچر کا کوئی عمل دخل نہیں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ اسپنگلر کا یہ دعوے کہ یورپ کا کلچر، یونانیت کے خلاف ہے، سراسر درست ہے، لیکن اسے اخلاقی جرأت کا ثبوت دے کر یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے تھی کہ یونانیت کے خلاف یہ جذبہ قرآن حکیم کی تعلیم کی بدولت ہی پھیلا تھا۔ اور پھر اس کا اثر یورپ کے تمدن پر بھی مرتب ہوا تھا اسپنگلر کا یہ نظریہ کہ اسلام کا اپنا کوئی منفرد تشخص نہیں، بلکہ اس کا کلچر، مجوسیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، یقیناً حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

اس ضمن میں عمر فاروق درست فرماتے ہیں کہ اسپنگلر نے اسلامی ثقافت کو سراسر مجوسی بنا دیا اور وحدت الوجود کے نظریے کو اس سے منسوب کر دیا۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب کے متعلق اسپنگلر کہتا ہے کہ اس کی روح فنکشنل (Functional) یعنی حرکی ہے۔ سوچتی ہے، محسوس کرتی

ہے اور خود مختار ہے۔ خود مختاری جو یونانی فلسفے میں ناپید ہے۔ Faust کے کلچر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اقبال نے اسلام کے متعلق اسپنگلر کے خیالات بیان کرنے کے بعد ان کی تردید کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی کہ البیرونی نے زندگی کے سکونی نظریے کے خلاف بہت پہلے آواز بلند کی تھی کہ یہ اسلام کی روح سے متصادم اور یونان کے سکونی نظریے کے مطابق ہے، اسی لیے اسپنگلر کا خیال کہ حرکت کا تصور، مغربی کلچر کے علاوہ کسی اور کلچر میں نہیں، سراسر غلط بیانی پر مبنی ہے۔ اقبال کے خیال میں اسلام اسی حرکی کلچر کا دعوایدہ ہے اور اسی حرکی کلچر کا اثر یورپ پر مرتب ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کا کلچر اینٹی کلاسیکل ہو گیا تھا۔

جناب عمر فاروق، ہماری توجہ، اقبال کے اس قول کی جانب دلاتے ہیں کہ اگر ہم زندگی کو حرکی سمجھیں اور اس میں فنکشن کا تصور شامل کر دیں تو "وقت" کی اہمیت سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ یہ فنکشن خیال سکونی نظریے کی طرف لے جاتا ہے اور اس طرح کائنات کو ایک Being یا موجود ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کا تصور یہ ہو جاتا ہے کہ یہ "موجود" کچھ اور بن جائے گا۔ اس سے کائنات، سکونی چیز نہیں رہتی بلکہ ایک پھلتی پھولتی حرکت سے معمور، ہر وقت تبدیل ہونے والی چیز بن جاتی ہے۔

جناب عمر فاروق نے بڑے مدلل انداز میں اقبال اور فلسفۂ مغرب کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے اور ایسے تمام نظریات کی تشاندہی کر دی ہے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں۔ تاہم کتاب میں چند پہلو تشنہ رہ گئے ہیں مثلاً:

فاضل مصنف سے بڑھ کر اس حقیقت سے اور کون واقف ہوگا کہ "حیاۃ" جیسی وجودیاتی حقیقت کو ابنِ خلدون اور اسپنگلر دونوں نے وسعت عطا کی تھی، ورنہ اس سے قبل اہلِ فکر اسے صرف حیوانات بشمول انسان ہی سے مخصوص سمجھتے تھے۔ یہ دونوں مفکر، قوموں اور ثقافتوں کو بھی اس کے دائرہ میں لے آئے۔ اقبال کی فکری تربیت میں بھی ان مفکرین کا بڑا دخل ہے۔ چنانچہ اقبال کی فکر میں قوموں کی تقدیر اہم ترین موضوعات میں سے ہے۔ ایک بات جو اقبال کو ابنِ خلدون اور اسپنگلر سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ گو تقدیر کا عمل ہر ملت اور ہر سماج میں جاری ہے، مگر یہ لازم نہیں کہ سب کے لیے تقدیر کا ایک ہی قانون ہو۔ چنانچہ اسی بنیاد پر وہ ان نتائج سے اتفاق نہیں کرتے کہ آخر کار ہر قوم یا تمدن، انجام کار فنا ہو جاتا ہے۔

کتاب زیرِ نظر میں اس مسئلہ پر کوئی سیر حاصل بحث نہیں ملتی۔

جبر و اختیار کے مسئلہ پر عمر فاروق نے تفصیلی مقالہ رقم کیا ہے۔ مگر بات زیادہ واضح نہیں ہوسکی راقم کے خیال میں اقبال، مشیت کے قائل ہیں۔ اگرچہ واقعات میں مشیت کا قانون جاری و ساری ہے مگر خود مشیت اقبال کے مطابق کسی ایک سلسلے کی پابند نہیں۔ اس کے بہت سے سلسلے ہیں۔ اقبال کے نظریۂ جبر و اختیار میں ایک تازگی ہے، ایک گہرائی ہے اور یہ ابن خلدون اور اسپنگلر کے مقابلے میں زیادہ طرح دار ہے۔ وہ ان کی طرح جبری ہیں بھی اور نہیں بھی۔ اسپنگلر کا پیغام آخر موت کے علاوہ اور ہے کیا؟ اس کے انکار قوی حیات کے لیے "موت" کو آخری قرار دیتے ہیں۔ اور فنا کو وجوب کا درجہ دیتے ہیں۔ اقبال، فنا کے منکر نہیں، مگر وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ فنا، ایک وجوب یا لازمی انجام ہے۔ جو قوم حیات پرور راہ پر چلے گی، اس کے لیے ایک احیا کے بعد دوسرا احیا ہوگا اور جو مرگ افزا راہ پر چلے گی، وہ فنا ہو جائے گی۔ ایک موت کے بعد دوسری موت اس کی منتظر ہوگی۔

عمر فاروق کو موت نے مہلت ہی نہیں دی کہ وہ انسانی تقدیر کے اسلامی پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرسکیں۔ اب اہلِ فکر و دانش پر لازم ہے کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں اور ساتھ ہی اقبال کے کلام کو جو مشکل کوشی اور خطر پسندی کا سبق دیتا ہے، عام کریں۔ اقبال کے تصورِ تعلیم کو بھی جو عقبہ نہاد تہذیب کی روح ہے اور زندگی کو نئے اقدار سے روشناس کراتا ہے، عام کرنے کی ضرورت ہے۔

All rights reserved ©2002-2006

295

مجلّۂ وجدان

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
اقبال اکادمی پاکستان
©2002-2006

مرتب : اشرف بخاری

مبصر : محمد اصغر نیازی

مجلہ وجدان

اشرف بخاری

سید محمد اصغر سبزواری

All rights reserved
©2002-2006

نام رسالہ — وجدان

مرتب — اشرف بخاری

ناشر — اکادمی تحقیقات و نشریات اسلامی پاکستان پشاور

مبصر — محمد اصغر نیازی

اکیڈمی تحقیقات و نشریات اسلامی کا قیام اس سال کے آغاز میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کا مقصد و منہاج یہ ہے کہ عصری تناظر کے حوالے سے اسلام اور عالم اسلام کو جو مسائل درپیش ہیں ان پر تحقیقی لٹریچر پیش کر کے افرادِ امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا جائے۔ مرتبِ 'وجدان' جناب اشرف بخاری مجلہ کے حرفِ آغاز میں لکھتے ہیں:

"منتخب تحریروں پر مشتمل 'وجدان' کا زیرِ نظر مجموعۂ مقالات اکادمی تحقیقات و نشریات اسلامی (پاکستان) کے سلسلۂ مطبوعات کی اولین کوشش ہے۔۔۔۔"

اور حرفِ آغاز کا آخری فقرہ ہے:

"وجدان ربِ کائنات کے بھروسے پر اس عزم کے ساتھ حاضر ہو رہا ہے کہ وقت کے اندھیارے احیائے امت کی اس منزل کو کھوٹا نہ کرنے پائیں جو ہماری شناخت کا عمل ہے۔"

اکادمی کے نمائندہ مجلہ "وجدان" کی اپنی ہی بیان کردہ اس شناخت کے آئینے میں فہرستِ مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے یہ احساس یقین کی طرح دمک اٹھتا ہے کہ جس اہم ذمہ داری کا بیڑہ اٹھانے کا عزم کیا گیا ہے، اکادمی کا پہلا شمارہ اس کا ایک ارفع و اعلیٰ آغاز ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اس عظیم الشان کام کی یہ ابتداء اس شعر کا مصداق بن جائے۔

تیرے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

میری انتہائے نگارش یہی ہے

البتہ ایک اور احساس بھی ہوتا ہے کہ سلسلۂ مطبوعات کی 'اوّلین کوشش' اگر اکادمی تحقیقات و نشریات کے مقصد و منہاج کی توضیح و تشریح کے لیے وقف کر دی جاتی، یہی کہ کرنے کا اصل کام کیا ہے اور اُسے کس طرح کیا جائے تو اسلام اور مسلمانوں کے لیے تڑپ رکھنے والے گہرے احساس اور شعور کے ساتھ اُن کے عزم میں شریک ہو جاتے یا پھر حرفِ آغاز ہی اس قدر مختصر اور تشنہ نہ ہوتا۔

بہر حال اس قدر مختصر سے حرفِ آغاز کے بعد ایک مبسوط مقالۂ افتتاحیہ کی ضرورت، باقی کے مضامین دیکھنے کے باوجود باقی رہتی ہے جو امید ہے کسی اگلے شمارے میں پوری کر دی جائے گی۔ زیرِ نظر شمارے کے اردو حصے میں کل چھ مضامین شاملِ اشاعت ہیں، ان مضامین میں اس قدر تنوع اور رنگارنگی ہے کہ اگر سب میں اسلام کا حوالہ موجود نہ ہوتا تو کوئی بھی تضاد کا اعتراض کر دینے میں حق بجانب تھا تاہم یہی تنوع ہی اسلام کے دینِ فطرت اور مکمل نظامِ حیات ہونے کی نشانی ہے۔

مجلّے کے پہلے مقالے کا عنوان "ادب، اسلامی اقدار اور عصری تقاضے" ہے صاحبِ مضمون نے منیر نیازی کے اس شعر کو اس ضمن میں اپنے افکار کا خلاصہ قرار دیا ہے۔

فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیر
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

البتہ ہماری طرف سے اس قدر گزارش ہے کہ اللہ کا کلام نقد و ادب کے ہر معیار کے لحاظ سے علم و ادب کا بے بدل شاہکار ہے جو نکہ اللہ "لیس کمثلہٖ شیاً" ہے کوئی بھی اپنے کلام کے بارے میں اُس کے چیلنج "فاتو بسورۃ ان کنتم صادقین" کا جواب آج دن تک پیش نہیں کر سکا اور نہ ہی قیامت تک کر سکے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی قرآن مجید کو اپنا محور و مرکز بنایا جائے تاکہ مسلمانوں کے ہاں ادب کے بارے میں اسلامی اور غیر اسلامی کی تقسیم محض ایک بے دلیل ڈھونس کی حیثیت اختیار نہ کر جائے۔

جہاں تک دوسرے مضمون "سائنس کی تعلیم میں نظریات کا دخل" کا تعلق ہے تو ہمیں صاحبِ مقالہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ یہ سائنسی علوم ہی تھے جن کے ذریعے مسلمانوں نے صدیوں دنیا پر حکمرانی کی اور اب بھی وہ اسی کے ذریعے ایک بار پھر بامِ عروج پر پہنچ سکتے ہیں۔ صاحبِ مضمون اپنے اس مقدمے کو ثابت نہیں کر سکے بلکہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ تاہم

اسلام کی تعلیمات، قرآن کے فرمودات، اسوۂ رسولؐ اور سیرت صحابہ کی روشنی میں یہ بات جس طرح کہی گئی ہے، بالکل گمراہ کن، بے جوڑ اور بے محل ہے۔ کاش وہ اس جملے میں سائنس کی بجائے قرآن کا لفظ استعمال کرتے کہ سائنس بھی دوسرے دنیوی علوم کی طرح بیالوجی کا ادنیٰ سا ایک پرتو ہے۔ اسلام میں ہر شے کی قدر و قیمت اور حیثیت صرف اور صرف قرآن سے متعین ہوتی ہے کیونکہ ہر مسلمان کے لیے بقول اقبال:

غیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

مجلے کا آخری مضمون "عہد فاروقی کی انتظامیہ، ایک جھلک" کے نام سے زیب اشاعت ہے۔ عہد فاروقی، عہد صدیقی کی طرح تاریخ اسلام میں عہد رسالت کے بعد ایک مستند حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیوروکریسی کے حوالے سے یہ مضمون تحقیق کے عام معیار پر پورا نہیں اترتا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مجلے کے سارے ہی مضامین بہرحال تشنہ اور خام ہیں تو اس کے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تشنگی قارئین کے لیے درپردہ دعوتِ سخن ہے، بایں ہمہ چاہیئے تو یہ تھا کہ پہلے شمارے میں نشاناتِ منزل اس قدر اجاگر کردیئے جاتے کہ کسی کے لیے کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہتا۔ البتہ "پشتو میں دینی ادب" کے نام سے مقالہ بہر طور ایک علمی اور تحقیقی کاوش ہے۔ پروفیسر عارف نسیم نے بڑی محنت سے تحقیقی مواد اکٹھا کر کے ایک احسن ترتیب میں پیش کر دیا ہے جو قابلِ داد ہے بلکہ ایک ایسا "سلسلۂ مضامین" بن سکتا ہے جسے اگر اکادمی تحقیقات و نشریات اسلامی چاہے تو پاکستان کی سب ہی علاقائی زبانوں پر پھیلایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ ہجرت کے بارے میں مضمون بھی بے حد وقیع اور ہمہ گیر ہے۔ ہجرت کا فلسفہ و تاریخ، ہجرت کی اقسام و مواقع اور بعض تاریخی ہجرات پر سیر حاصل بحث کے بعد آخری بات یہ کہی گئی ہے کہ ہجرت کامیابی کی کنجی ہے جس کے اثرات صرف افراد پر نہیں بلکہ نظریے اور قوم و ملک پر بھی پڑتے ہیں۔ البتہ اس مبسوط مقالہ میں ایک بات کھٹکتی ہے۔ صاحب مضامین نے سفرِ طائف کو بھی ہجرت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ یہ ایک تبلیغی سفر تھا اس کے لیے حضورؐ نے ارادۂ ہجرت نہیں کیا تھا بلکہ آپ جلد ہی واپس مکہ آ گئے تھے اور پھر کافی دیر کے بعد مدینہ کو ہجرت کی نیز ایک بات اور یہ ہے کہ آپؐ سورہ زخرف کی آیت "وقالو لولا نزل ہذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم" کے مطابق مکہ اور طائف کی طرف معبوث کیے گئے تھے، طائف والے بھی آپ ہی کی قوم تھے۔ ہجرت اپنی قوم کی طرف نہیں کی جاتی ہمیشہ کسی اور

GIFT

قوم کی طرف ہوتی ہے چنانچہ آپ نے قریش کو چھوڑ کر مدینہ کے قبائل کی طرف ہجرت فرمائی
اس غلطی کی وجہ ہمارے ناقص خیال میں یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ سیرت و تاریخ کے
مطالعے کے لیے قرآن کو مدنظر نہیں رکھتے بلکہ اپنی طرف سے نتائج اور نکات اخذ کرنے بیٹھتے
ہیں جیسا کہ صاحبِ مقالہ نے خود اعتراف کیا کہ سفرِ طائف درحقیقت ایک تبلیغی سفر تھا لیکن
میں نے اسے ہجرت اس لیے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار مکہ سے باہر بغرضِ تبلیغ
تشریف لے گئے لیکن یہ سفرِ طائف کو ہجرت کہنے کا ایسا جواز ہے جسے کوئی بھی انصاف پسند
صحیح نہیں سمجھے گا۔

... LIBRARY, ... PAKISTAN
Acc. No.......
18606
LAHORE.